

مسئلہ تملیک اور زکوٰۃ سے متعلق بعض دوسرے مسائل

(راز: مولانا امین الحسن صاحب اصلاحی)

(۲۱)

کیا ایک مقام کی زکوٰۃ دوسرے مقام پر صرف نہیں ہو سکتی؟ دوسری چیز جو مولانا ظفر احمد صاحب کے مضمون میں نہایت قابل غور و اہل علم کے فکر و نظر کی محتاج ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کی تقسیم کا معیاری طریقہ صرف یہ ہے کہ محصلین زکوٰۃ ہر جگہ کھیتوں، کھلیا لوں اور چراگاہوں میں پھیل جائیں، زکوٰۃ وصول کریں اور وہیں غریبوں میں تقسیم کر دیں اور جب تک اس علاقہ میں غریب و مستحقین موجود ہیں وہیں جگہ اس علاقہ کی زکوٰۃ منتقل نہ کریں۔

قطع نظر اس سے کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں جو محاصل کی تشخيص و تحصیل کے معاملہ میں جدید نظریات کی معتقد ہیں اور ہر کام کو منصوبہ بندی کے تحت کرنا پسند کرتی ہیں، اس چیز کو اپنا سکتی ہیں یا نہیں، اس میں دو نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا ایک تو یہ کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو علاقہ زیادہ پست حال میں وہ برابر پست حال ہی رہیں، کم از کم زکوٰۃ کی مدد سے ان کی اصلاح و ترقی میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا جا سکتا کیونکہ پست حال علاقوں میں قدرتی طور پر زکوٰۃ کی آمدنی بہت تھوڑی ہوگی اور دوسرے علاقوں کی زکوٰۃ ان علاقوں کی امداد کے لیے مشکل ہی سے کچھ منتقل کی جا سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ کوئی حکومت کسی منصوبہ بندی کے تحت اپنی زکوٰۃ کی پوری آمدنی کسی ایسی فوجداری اور مفید اسکیم پر نہیں خرچ کر سکتی جس سے اس ملک کے پست حالوں اور غریبوں کو بحیثیت مجموعی کوئی مستقل فائدہ پہنچے۔ حالانکہ موجودہ زمانہ منصوبہ بندی کا زمانہ بننے منصوبہ بندی کے ذریعہ سے اگر کوئی حکومت چاہے تو دیکھتے دیکھتے، اپنے اپنی ذرائع سے کام لے کر جو منتر طور پر استعمال ہونے کے سبب سے کوئی مؤثر نتیجہ پیدا نہیں کر رہے ہیں، اپنے ملک کے غریبوں کی کایا پٹ سے سکتی ہے ہم بات بات پر کہتے ہیں کہ اگر اسلام کا اقتصادی نظام ملک میں جاری ہو جائے تو غریبوں کے

آسمان وزمین بدل جائیں گے۔ لیکن اگر غریبوں کے حصہ کی اصلی آمدنی نکالی ہی حشر ہوگا کہ ہر تھانہ کی زکوٰۃ اسی تھانہ میں تقسیم ہوگئی تو اشتراکیت کا مقابلہ کرنا تو الگ رہا، شاید ہم زکوٰۃ کی آمدنی سے غریبوں کی بے شمار مشکلات میں سے کوئی ایک مشکل بھی حل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے زمانہ میں حکومت کی پالیسی عموماً یہی رہی ہے کہ جس جگہ سے زکوٰۃ وصول کی جائے، اگر حقیقی ضرورت وہاں موجود ہو تو وہیں خرچ بھی لڑی جائے، وہاں سے مرکز کو منتقل نہ جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ایک انتظامی معاملہ تھا جو محض وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت عمل میں آیا تھا یا شریعت کا قانون ہی یہی ہے کہ ہر تھانہ بلکہ ہر بستی کی زکوٰۃ اسی تھانہ اور اسی بستی میں تقسیم کر دی جائے؟ نہایت واضح دلائل کی روشنی میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ محض ایک انتظامی معاملہ ہے اسلامی حکومت اختیار رکھتی ہے کہ وہ چاہے تو ہر تھانہ اور ہر بستی کی زکوٰۃ اسی تھانہ یا بستی میں تقسیم کرادے، چاہے تو کسی خاص علاقہ میں اگر اس علاقہ میں ایمر منسی کی صورت پیدا ہوگئی ہو، پورے ملک کی زکوٰۃ اکٹھی کر کے خرچ کر دے۔ اور اگر چاہے تو کسی مرکزی اسکیم کے تحت پورے ملک کی زکوٰۃ کنٹرول کر کے اس کو ملک کے غریبوں کی نفع بخش اسکیم میں لگا دے، جس سے سب کو فائدہ پہنچے۔

اس کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ اگر مقصود انفرادی تقسیم ہی تھی تو زکوٰۃ کے معاملہ کو حکومت کے ہاتھ میں دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ حکومت کے ہاتھ میں تو دیکھتے ہی وہ معاملات جاتے ہیں جن کے اندر کوئی اجتماعی نوعیت کا تصرف پیش نظر ہو۔ اگر یہ چیز مقصود نہیں تھی تو اول تو حکومت کے سینے بہتہ یہی تھا کہ وہ سرے سے اس کو ہاتھ میں لیتی ہی نہ اور اگر لیتی بھی تو بس اس حد تک کہ اس کے عمال ہر جگہ عرفہ اس بارش کی نگرانی کرتے رہتے کہ لوگ اپنی اپنی زکوٰۃ میں نظائیں اور غریبوں میں تقسیم کر دیں۔ اگر لوگ اس میں سست پڑتے نظر آتے تو ان کو تہنیتی یا تہنیتی سے اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے۔

دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر یہ معاملہ محض انتظامی نوعیت کا نہ ہوتا بلکہ شریعت کا حکم ہی یہ ہوتا کہ ایک جگہ یا زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہ ہو تو کم از کم سد باؤل میں تو اس کا امکان نہیں تھا نہ اس حکم کی خلاف ورزی کی جاسکتی۔ لیکن ہم صاف دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے زمانہ میں مرکزی حکومت برادراحت اپنی

ہدایات کے تحت زکوٰۃ کو منتقل بھی کرتی ہے اور نہیں بھی کرتی ہے، کبھی اپنا حصہ کچھ مقرر کرتی ہے کبھی کچھ کر لیتی ہے بلا لحاظ اس کے مقامی غرباء کی ضروریات پروری ہو چکی ہیں یا نہیں؟ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں قانون کے تحت سارے اختیارات حکومت کو حاصل ہیں۔ وہ مختلف علاقوں کے حالات اور غرباء کے مصالح کے تحت اس میں ہر قسم کا تصرف کر سکتی ہے۔ ذیل میں ہم اہل علم کے غور کرنے کے لیے اپنے خیال کی تائید میں چند دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

جس زمانہ میں مدینہ میں مہاجرین کا مسئلہ اقتصادی نقطہ نظر سے ایک پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا تھا اس زمانہ میں اطراف مدینہ کی زکوٰۃ بڑے اہتمام کے ساتھ وصول کر کے مدینہ منگوائی جاتی تھی تاکہ مہاجرین کی مشکلات حل کی جاسکیں۔ یہاں تک کہ ایک اعرابی نے آنحضرت صلعم سے وصولی زکوٰۃ کے سلسلہ میں عمال کے رویہ کی سختی کی شکایت کی کہ صدقہ کی ایک بکری کی خاطر مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میں قتل نہ کر دیا جاؤں حضور نے اس کے جواب میں اس سختی کے لیے جو وجہ بیان فرمائی وہ یہ تھی کہ

لولا انھا تعطی فقراء المهاجرین ما
اخذنھا۔ رذیل الاوطار ج ۳ - ص ۱۶۱
اگر یہ چیز غریب مہاجرین کو نہ دینی ہوتی تو میں اس کو
نہ لیتا۔

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حوالی مدینہ کی زکوٰۃ وصول کر کے مدینہ منگوانے کی اصلی وجہ یہی تھی کہ مدینہ میں بے سہارا مہاجرین کا مسئلہ ایک پریشان کن مسئلہ بنا ہوا تھا جس کو حکومت کے لیے حل کرنا ضروری تھا۔ یہ وجہ تھی کہ حوالی مدینہ میں زکوٰۃ کے مستحقین پہنچیں نہ تھے۔

اسی مہاجرین کے مسئلہ کے سبب سے اہل مین کے ساتھ زکوٰۃ کے معاملہ میں دو مختلف زمانوں میں دو مختلف پالیسیاں اختیار کی گئیں۔ جس زمانہ میں مہاجرین کا مسئلہ پیچیدہ بنا ہوا تھا اور غالباً کپڑوں کی ان کے لیے شدید ضرورت تھی اس زمانہ میں مین میں آنحضرت صلعم کے نمائندے حضرت معاذ نے اہل مین سے ان کے صدقات کی تمام اصناف و اجناس کے بدلہ میں صرف نئے اور پرانے کپڑے وصول کیے اور وہ سارے کپڑے مہاجرین کے لیے مدینہ روانہ کر دیئے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی کم اہم ضروریات کے مقابل میں انہوں نے مہاجرین کی زیادہ اہم ضرورت کو مقدم رکھا۔ حضرت معاذ کے اعلان کے الفاظ ملاحظہ ہوں جس سے صاف وہ مفہوم نکلتا ہے

جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

ابتوتی بكل خمیس وليس اخذك منك
مكان الصدقة فانه ارفق بكم وانفع للمهاجرين
والانصار بالمدينة

تم میرے پاس ہر قسم کے سٹے اور پرانے کپڑے لاؤ میں
صدقہ کے معاوضہ میں اس کو قبول کر لوں گا۔ اس میں تمہیں
آسانی ہو جائے گی اور مدینہ کے مہاجرین اور انصار کا
بھلا ہو جائے گا۔

رنیل الاوطار - ج ۲ - ص ۱۶۱

کون کہہ سکتا ہے کہ ان کپڑوں کے مدینہ بھیجنے کا سبب صرف یہ تھا کہ یمن میں اس کے مستحقین موجود نہیں تھے؟
مستحقین رہے ہونگے لیکن مدینہ کے مستحقین کا معاملہ مختلف پہلوؤں سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا، اس وجہ سے
ان کو مقامی مستحقین پر ترجیح دی گئی۔

لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب یہ مہاجرین کا مسئلہ بالکل حل ہو گیا تو اسی یمن کی زکوٰۃ کا صرف ایک
تہائی حصہ انہی حضرت معاذؓ نے مدینہ بھیجا تو حضرت عمرؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ میں نے تمہیں ٹیکس وصول کرنے والا
 بنا کر نہیں بھیجا ہے، اس لیے بھیجا ہے کہ وہاں کے مالداروں سے وصول کرو اور وہیں کے غریبوں میں تقسیم کر دو۔
اور جب تک حضرت معاذؓ نے ان کو یہ اطمینان نہیں دلایا کہ یہاں زکوٰۃ کے مفید حصہ موجود ہی نہیں ہیں اس وقت
تک انہوں نے وہاں کی زکوٰۃ مدینہ بھیجنے کی اجازت نہیں دی۔

اسی طرح ایک سے زیادہ مثالیں اس بات کی موجود ہیں کہ مرکز نے کسی مقام کی زکوٰۃ میں اپنا ایک متعین
حصہ مقرر کر دیا ہے اور اس بات کی کوئی تصریح نہیں کی ہے کہ مرکز کا حصہ صرف اس حالت میں مرکز کو بھیجا جائے
جبکہ کوئی مقامی مستحق موجود نہ ہو۔ مثلاً حضرت عمرؓ کے متعلق ابو عبید نے یہ روایت نقل کی ہے۔

عام الروادہ کے قحط کے موقع پر حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ کی
تحصیل کا کام روک دیا تھا۔ جب قحط دور ہو گیا تو انہوں
نے ابو ذبابؓ کو تحصیل زکوٰۃ کے کام پر مقرر کیا اور ان کو یہ
حکم دیا کہ لوگوں سے اگٹھے دو سالوں کی زکوٰۃ وصول کرو اور ان
میں تقسیم کر دو۔ آدمی میرے پاس بھیجو۔

قال لابن ابي ذباب وبعثه بعد عام
المادة فقال اعقل عليهم عقالين فاقسم
فيهم احد هما واتني بالآخر
رکتب الاموال ص ۶۰۰

اسی طرح ایک روایت حضرت عمر بن عبدالعزیز کے متعلق بھی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اموال
 زکوٰۃ میں مرکز کا حصہ ادا مقرر کیا۔ پھر دوسرے سال جب انہوں نے مرکز کے لیے ضرورت نہیں محسوس کی تو ہر
 جگہ کی زکوٰۃ مقامی طور پر ہی تقسیم کر دینے کا حکم دے دیا۔

عن ابن جریر قال كتب عمر بن عبد العزيز
 الى عماله ان صنعوا شطر الصدقة والبخشا
 الى شطرها قال ثم كتبت في العام المقبل ان
 صنعوها كلها۔

ابن جریر روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے
 تحصیلداروں کو لکھا کہ زکوٰۃ کی آدھی رقم مقامی ضروریات کے
 لیے رکھ چھوڑو اور باقی میرے پاس بھیج دو۔ پھر دوسرے
 سال انہوں نے یہ حکم جاری کر دیا کہ ساری کی ساری مقامی
 ضروریات ہی کے لیے رکھ چھوڑو۔

کتاب الاموال ص ۱۵۹۲

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم سے متعلق یہ تصور کچھ بہت
 صحیح نہیں ہے کہ ہر گاؤں اور ہر تھانہ کی زکوٰۃ وہیں وصول کر کے کھڑے کھڑے تقسیم کر دی جائے بلکہ جیسا کہ عرض
 کیا گیا یہ معاملہ تمام تر حکومت کی صوابدید پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو مقامی طور پر تقسیم کر دے۔ چاہے تو اس
 میں مرکز کا کوئی متعین حصہ مقرر کر دے۔ چاہے تو کسی اہم ضرورت کے پیش نظر کسی علاقہ کی پوری زکوٰۃ کسی
 دوسرے علاقہ کے غریبوں کی امداد کے لیے اس علاقہ میں بھیج دے۔ اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر چاہے
 تو پورے ملک کی زکوٰۃ مرکزی کنٹرول میں لے کر زکوٰۃ کے مذکورہ مصارف میں سے کسی ایک ہی مصرف پر صرف
 کرے یا ملک کے غریبوں کی اجتماعی بہبود کی کسی خاص اسکیم پر صرف کرے۔

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ آنحضرت صلعم نے جب حضرت معاذ کو مین بھیجا ہے تو ان کو یہ ہدایت فرمائی
 کہ خذها من اغنياءهم وضعها في فقرائهم لان کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کرو اور ان کے غریبوں میں
 اس کو بانٹ دو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ ہر جگہ کے مقامی مالداروں کی زکوٰۃ کے اصلی مستحق
 اسی مقام کے غریب ہیں۔ ہمارے نزدیک اس شبہ کی بنیاد کچھ قوی نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ خود حضرت معاذ نے بھی
 نبی صلعم کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں سمجھا کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ اس کا یہ مطلب
 سمجھتے تو یہ بات کس طرح ممکن تھی کہ وہ اس حکم کے بالکل خلاف اہل مین کے سامنے یہ اعلان کرتے کہ استونی

بکل خمیس و لبیس اخذاً منکم مکان الصدقة فانه ارفق بکم وانفع للمهاجرین والانصار
بالمدينة (ہر قسم کے نئے اور پرانے کپڑے میرے پاس لاؤ، میں صدقہ کی جگہ ان کو قبول کروں گا اس میں تمہیں
بھی آسانی ہوگی اور مدینہ کے مہاجرین و انصار کا بھی بھلا ہوگا)۔

اب یا تو یہ ہو کہ عام پالیسی تو یہی رہی ہو کہ مقامی اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کر کے وہیں مقامی غریبوں میں
تقسیم کر دی جائے لیکن خاص مرکز کی ہدایت کے تحت مہاجرین کی ضرورت کے پیش نظر انہوں نے کسی سال
اہل میں سے مذکورہ بالا مطالبہ کیا ہو، یا یہ ہو کہ انہوں نے توخذ من اغنیاء ہم وتود علی فقرا لہم کہ
اس کے وسیع معنی میں لیا ہو اور ایک انتظامی حکم کی حیثیت سے حالات اور مصالح کے تحت جب جیسا مناسب
خیال کیا ہو اس پر عمل کیا ہو۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں سے جو شکل بھی فرض کی جائے یہ چیز بالکل صاف واضح ہے
کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ وہیں تقسیم کی جائے۔

یبلک اور ول کی حیثیت | اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے وصول کرنے اور اس کے تقسیم کرنے کا فریضہ
اصلاً ایک اسلامی حکومت ہی سے متعلق ہے۔ وہی جائز طور پر اس بات کی حقدار ہے کہ مالداروں سے
اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرے اور اس کے مصارف میں اس کو صرف کرے لیکن اگر کسی جگہ کے مسلمان
ایک صحیح اسلامی حکومت یا کم از کم جائز قسم کی اسلامی حکومت کی برکت سے محروم ہوں تو ان کے ایسے صحیح طریقہ
کیا ہے؟ کیا یہ کہ ان میں سے ہر شخص خود مستحقین کو تلاش کر کے ان میں اپنی زکوٰۃ تقسیم کر دے یا یہ کہ زکوٰۃ وصول
کرنے اور تقسیم کرنے کے لیے انہیں اپنے اندر کوئی اجتماعی نظم پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اس کے
فدیہ سے زکوٰۃ کی تحقیل و تقسیم کا ممکن حد تک کوئی مناسب بندوبست کرنا چاہیے؟ اس سوال کے جواب میں
میرا رجحان یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ دوسری ہی صورت صحیح ہے۔ میرے نزدیک اسکی دو وجہیں ہیں۔

۱۔ اسلام کا فراج یہ ہے کہ اگر اس کے احکام میں سے کسی حکم کی بجا آوری اس کی اصلی معیاری شکل میں کسی
مانع کے سبب سے ممکن نہ ہو تو وہ پابند ہے کہ اس حکم کی تعمیل کسی ایسی شکل میں کی جائے جو اصلی شکل سے
ملتی جلتی یا کم از کم ذہنوں کے اندر اصلی شکل کی یاد محفوظ کرانے والی ہو تا کہ اصلی حالت کی طرف لوٹنے اور اس
دوبارہ حاصل کرنے کا شوق دلوں کے اندر قائم رہے۔ چنانچہ جب وضو کرنا کسی مانع کے سبب سے ممکن نہیں ہوتا

تو اس کی جگہ پر تخم کی ہدایت کی گئی ہے، اگر نماز، اس کی اصلی صورت میں ادا کرنی ممکن نہ ہو تو اس سے قریب تر صورت پر اس کو ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ جنگ کے خطرناک ترین حالات کے اندر بھی اس کے لیے ایسی صورتیں تجویز کی گئی ہیں جس سے اس کی اصلی صورت کا تصور ذہنوں میں باقی رہ سکے۔ یہی صورت حال دین کے دوسرے احکام کے اندر بھی ہے۔ اگر ان کو اس معیاری شکل میں ادا نہیں کیا جاسکتا ہے جو قرآن یا حدیث میں ان کے لیے تجویز کی گئی ہے تو حالات کے لحاظ سے اصل سے ممکن حد تک قریب تر شکل میں ان کو ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس کلیہ کو ہمیشہ نظر رکھ کر اگر زیر بحث سوال پر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا کام دین میں اجتماعی طور پر مطلوب ہے اور اس کے انجام دینے کی اصلی مجاز اور حقدار درحقیقت ایک اسلامی حکومت ہی ہے، اس وجہ سے اس کی عدم موجودگی میں دین کے مزاج سے اقرب بات یہی ہوگی کہ مسلمانوں کے اندر جس طرح کا نظام شرعی بھی موجود ہو اسی کو اس فرض کی انجام دہی کا ذریعہ بنایا جائے۔ اور اگر خدا نخواستہ کسی قسم کی بھی کوئی اجتماعی تنظیم دینی باقی نہ رہ گئی ہو تو مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی کوئی تنظیم قائم کرنے کی کوشش کریں۔ حد یہ ہے کہ اگر کوئی ایک ہی تنظیم قائم نہ ہو سکے تو اصل سے قریب تر لانے کے لیے یہ شکل بھی گوارا کی جاسکتی ہے کہ ایک سے زیادہ تنظیمیں ہوں جو اپنے اپنے حلقہ اثر اور اپنے اپنے دائرہ اعتماد کے اندر اس فرض کو انجام دیں۔ مگر چہ ایک تنظیم کی جگہ کسی تنظیموں کا ہونا ایک امتیاز کی صورت ہے لیکن اصل نصب العین سے ذہنوں کو وابستہ رکھنے کے لیے یہ اس کے متقابل میں نہیں بہتر ہے کہ سرے سے کوئی تنظیم ہی باقی نہ رہ جائے اور ایک کامل امتیاز کی حالت طاری ہو جائے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کسی نوعیت کی بھی کوئی تنظیم باقی نہ رہ جائے یا کسی تنظیم کے بھی جو موجود ہو اشتقاق کو تسلیم نہ کیا جائے بلکہ ایک شخص پر اس کی زکوٰۃ سے ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری ڈال دی جائے تو یہ چیز اعتماد کے نقطہ نظر سے بھی نہایت مضربوں کی اور بے فائدہ ہے۔ سب سے بھی نہایت جہلک ہوگی اقل تو کسی محرک یا داعی کے نہ ہونے کے سبب سے بہت زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ جو مسلمان آج اپنے مالوں کی زکوٰۃ نکالتے ہیں ان میں سے بھی بہت سے سرے سے زکوٰۃ نکالنا ہی چھوڑ دیں۔ اور اگر نکالیں بھی تو ان کی

سہل انگاریوں کی وجہ سے اس کا بڑا حصہ ضائع ہی ہو جائے، بازار میں ایک تنظیم کے زیر اہتمام فروخت ہونے کی صورت میں قرمانی کی جس کھال کی قیمت تین چار روپے مل سکتی ہے، بہت ممکن ہے کہ انفرادی طور پر فروخت کرنے کی صورت میں محلہ کا قصاب اس کے اٹھ آنے پیسے بھی نہ دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کسی صریح نقصان کو، جس میں زکوٰۃ دینے والے اور زکوٰۃ پانے والے دونوں شریک ہوں، اسلام کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے زکوٰۃ پانے والوں اور زکوٰۃ دینے والوں دونوں کی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اگر اسلامی حکومت باقی نہیں رہی ہے تو جو بھی مذہبی ادارے مسلمانوں کے اندر موجود ہیں وہی ان کاموں کو حتی الامکان سنبھال میں جو اجتماعی طور پر کرنے کے ہیں۔ جہاں تک دینے والوں کا تعلق ہے اگر وہ ان پر اعتماد کرتے ہیں تو یہ ادارے بلا اختلاف ان کے نمائندے اور وکیل ہیں۔ اور جہاں تک غرباء کا تعلق ہے ایک ایسے ملک میں جہاں اسلامی حکومت موجود نہیں ہے ان کی مثال ایسے تیاری کی ہے جن کا کوئی جائز ولی موجود نہیں ہے۔ اس وجہ سے جو ادارہ بھی ان کے حقوق ان تک پہنچانے اور ان کی خدمت کرنے کی ذمہ داری اٹھائے گا اس کو اس خاص دائرہ کے اندر کامل قسم کی نہ سہی لیکن ایک ناقص قسم کی ولایت تو بہر حال حاصل ہو ہی جائے گی۔

پس یہ بات عقل کے بالکل مطابق اور اسلام کے مزاج کے بالکل موافق معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی صورت میں وہ پبلک ادارے مسلمانوں کی زکوٰۃ میں اکٹھی کر کے غرباء کے مصالح پر صرف کریں جن کو پبلک کا اعتماد حاصل ہو۔ کیونکہ یہ صورت اختیار نہ کرنے کی صورت میں جو انتشار رونما ہوگا وہ اغیاد اور فقراء دونوں کے نقطہ نظر سے نہایت درجہ نقصان رساں ہے۔ اسی مصلحت کو سامنے رکھ کر مولانا مفتی کفایت مرحوم نے انگریزی وعد میں مندرجہ ذیل فتویٰ دیا تھا جو میرے نزدیک نہایت گہری دینی مصلحت پر مبنی ہے۔

میں یہ فتوے ناظرین کی آگاہی کے لیے یہاں مدج کرتا ہوں وہ فرماتے ہیں :-

۱۔ زکوٰۃ و عشر وغیرہ فرائض مالیہ کا وجوب جن حکم شرعیہ اور مصالح بشریہ پر مبنی ہے ان کا تقاضا یہ ہے کہ ادا شدہ زکوٰۃ و عشر اور مستحقین پر ان کی تقسیم میں تنظیم کا کامل لحاظ رکھا جائے اور ظاہر ہے کہ انفرادی تصرفات میں تنظیم مفقود ہوتی ہے۔

اس غلامی کے وعد میں جو تفرق و تشتت کا دور ہے اسکا کافی صورت یہی نظر آتی ہے کہ

اہل صل و عقد کی کوئی جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے

(محمد کفایت اللہ کان اللہ)

مصارف زکوٰۃ | اگر مذکورہ تینوں باتیں صحیح مان لی جائیں یعنی:

ایک یہ کہ ادائیگی زکوٰۃ کے لیے نمائیک کوئی مزدوری شرط نہیں ہے۔ اس کے حق میں کوئی نفع موجود نہیں ہے۔ جو لوگ نمائیک کے رکن یا شرط ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں جو کچھ پیش کرتے ہیں اسکی حثیت ایک استنباط سے زیادہ نہیں ہے۔ اور محض ایک استنباط اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر نمائیک کو زکوٰۃ کا رکن قرار دیا جائے۔

دوسری یہ کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل ہو سکتی ہے۔ ایک اسلامی حکومت اس باطن کی پوری طرح مجاز ہے کہ وہ چاہے تو ہر جگہ کی زکوٰۃ وہیں کے مقامی غریب پر صرف کر دے، چاہے تو کسی خاص علاقہ کی زیادہ شدید ضرورت کی بنا پر وہاں منتقل کر دے، چاہے تو ہر علاقہ کی زکوٰۃ میں سے مرکز کا ایک حصہ متعین کر دے اور اس کو خاص اپنے اہتمام میں صرف کرے۔ اور اگر چاہے تو پورے ملک کی زکوٰۃ اپنے اہتمام میں لے کر غریب کی بہبود کی کسی خاص اسکیم پر خرچ کرے۔

تیسری یہ کہ ایک اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی حالت میں مسلمانوں کے لیے صحیح سورت زکوٰۃ کے جمع کرنے اور خرچ کرنے کی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اس کے لیے کوئی اجتماعی نظم قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اس طرح کا کوئی ایک ہی اجتماعی نظم قائم نہ ہو سکے تو چھراؤنی درجہ میں ان کے لیے اسلام کے مزاج سے اور اس پالیسی سے جو اس نے زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کے بارہ میں پسند کی ہے یہ بات ہے کہ ان کے مختلف طبقات یا ان کی مختلف جماعتیں جن اسلامی ادارات پر اعتماد کرتی ہیں انہی کو وہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا ذریعہ بنائیں تاکہ ممکن حد تک زکوٰۃ کی افادیت اور غریب کی بہبود کو ملحوظ رکھا جاسکے۔ غریب مسلمانوں کی حقیقی صل۔ اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں انہی ادارات کو ان کی ولایت حاصل ہے۔ اور انہی کو یہ حق ہے کہ جب تک کوئی بہتر نظم وجود میں نہ آجائے یہ غریب کے لیے زکوٰۃ جمع کریں اور اسے غریب کے مصالح میں صرف کریں۔

اگر یہ تینوں باتیں اہل علم اور اہل دین کو اپیل کرتی ہیں اور ان کے حق میں جو دلیلیں اوپر بیان ہوئی ہیں وہ کچھ جاندار اور مننی معلوم ہوتی ہیں تو پھر مذکورہ کے مصارف پر ایک وسیع زاویہ نگاہ سے غور کرنا پڑے گا اور میں چاہتا ہوں کہ اپنا نقطہ نظر یہاں اہل علم کے سامنے رکھ دوں تاکہ وہ اس پر غور کر سکیں۔ قرآن مجید میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے مذکورہ کے مصارف کی تعیین سورہ توبہ کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفق الرقاب والغارمین وفق سبیل اللہ وابن السبیل (۶۰)۔ میں اسی آیت کے مختلف اجزا کی وضاحت کر دوں گا۔

فقراء اور مساکین | مذکورہ کا سب سے پہلا مصرف فقراء اور مساکین کو بتایا گیا ہے۔ یہ ذکر میں تقدیم اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کا حق مقدم ہے۔ یہ دونوں لفظ جب الگ الگ استعمال ہوتے ہیں تو بسا اوقات ایک دوسرے کے ہم معنی کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں لیکن جب ایک ساتھ آتے ہیں تو استعمالات سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک لطیف تم کا فرق ہوتا ہے۔ فقیر سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو کلمے، ہاتھ پاؤں مارنے، زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کا دم و اعیہ تو رکھتے ہیں لیکن مالی احتیاج ان کے راستہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہوتی ہے اور مسکین سے وہ طبقہ مراد ہوتا ہے جو مسلسل غربت اور احتیاج کا شکار رہنے کے سبب سے جدوجہد کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کا حوصلہ ہی کھو بیٹھتا ہے اور اس کے اوپر دل شکستگی اور مسکنت طاری ہو جاتی ہے۔ مذکورہ کا اولین مصرف یہ ہے کہ سوسائٹی کے ان دونوں طبقات کو اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

اس اٹھانے میں جس طرح یہ بات شامل ہوگی کہ ان کی جسمانی ضروریات سکھانا، کپڑا، اور مسکن۔ فراہم کی جائیں اسی طرح ان کی عقلی اور اخلاقی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے جس طرح یہ لازمی ہے کہ ان کی وقتی احتیاج رفع کی جائے اسی طرح یہ بھی غالباً ضروری ہے کہ ان کو نفسی اور بدعالی کی دلدل سے نکلنے کی مستقل تدبیریں اختیار کی جائیں تاکہ وہ اپنی ذاتی جدوجہد اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر سوسائٹی کے اندر باعزت زندگی بسر کر سکیں اور مستقلاً دوسروں پر بار بننے نہ ہونے کے بجائے دوسروں کے بوجھ اٹھانے کے قابل ہو سکیں۔ ان مقاصد کے پیش نظر مذکورہ کی مدد سے ان کے لیے رہنمائی اور مکان بھی مہیا کیا جاسکتا ہے، ان کے لیے تعلیمی اور تربیتی ادارے بھی کھولے جاسکتے ہیں، ان کے لیے دارالمطالعات اور کتب خانے بھی قائم

ہو سکتے ہیں، ایسے مستحق ادارے بھی ان کیسے جاری کیے جاسکتے ہیں جن میں ان کے بچے مختلف قسم کی صنعتیں سیکھ کر مستقبل میں اپنے اوپر اعتماد کے قابل بن سکیں۔ اسی طرح ان کے علاج کے لیے ایسے شفا خانے بھی کھولے جاسکتے ہیں جہاں بوقت ضرورت ان کو مفت دوا حاصل ہو سکے۔ جہاں ان کی عورتوں کو ولادت کے موقع پر مفت طبی امداد حاصل ہو سکے۔ علیٰ ہذا القیاس ان کے مردوں کی تھپنیر و تکفین کا انتظام بھی کیا جاسکتا ہے اور ان کے مزدوروں اور مردوں کے قرضے بھی ادا کیے جاسکتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے سارے کام غربا کے لیے زکوٰۃ کی مدد سے کیے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض صورتوں میں تملیک ہوگی بعض صورتوں میں نہیں ہوگی لیکن زکوٰۃ کا نفع ہر صورت میں اصلاً غرباء ہی کو پہنچے گا، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعی تملیک بہر حال غرباء ہی کی ہوگی۔

عالمین زکوٰۃ | زکوٰۃ کا دوسرا معنی زکوٰۃ کے عالمین ہیں۔ اگرچہ یہ زکوٰۃ کے مستحق تبعاً اور ضمناً ہیں، اصلاً نہیں ہیں، لیکن زکوٰۃ کی تحصیل و وصول میں چونکہ ان کو ایک ناگزیر عامل کی حیثیت حاصل ہے اس وجہ سے ان کا ذکر دوسرے ہی نمبر پر آگیا ہے۔ عالمین سے مراد زکوٰۃ کے وصول کرنے والے کارکن ہیں۔ اس لفظ کے اندر تحصیلدار سے لے کر اس کے پٹواری اور سپاہی تک سب شامل ہیں۔ قال ابن عباس۔ ویدخل فی العامل الساعی والکاتب والقاسم والحاشی الذی یجمع الاموال وحافظ المال والعریف۔^۱ عامل کے نقطہ کے اندر تحصیلدار، منشی، تقسیم کرنے والا، مال اکٹھا کرنے والا، خزانچی اور مکھیا سب شامل ہیں۔

احادیث اور تاریخ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کمیشن اور اجرت پر بھی یا جاتا رہا ہے اور اس غرض کے لیے وصولی زکوٰۃ کے موسم میں خاص طور پر کارکن بھی بھرتی کیے جاتے رہے ہیں، لیکن یہ موقع ان تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ سامنے لانا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کے اہتمام و انتظام پر جو عملہ مقرر ہوگا اس کے چھوٹے اور بڑے سارے کارکنوں کی تنخواہیں اس سے دی جاسکتی ہیں۔ اس کے آمد و خرچ کے ریکارڈ رکھنے کے لیے جو دفاتر قائم ہونگے ان پر بھی اسی مدد سے لازماً خرچ ہوگا۔ اور جب عالمین علیہا کے معاوضے اور ان کے دفاتر کے خرچ اس مدد سے پورے کیے جاسکتے

ہیں تو عمل علیہا پر یعنی عمل و نقل، فراہمی اور حفاظت وغیرہ پر، نیز اس سلسلہ کے پروپیگنڈے پر جو کچھ خرچ ہوگا آخر وہ کیوں نہیں اس مدرسے پورا کیا جاسکتا؟

ایک اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی صورت میں اگر اسلامی اداروں کو زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے صرف کا حق حاصل ہے، اور اس عاجز کے نزدیک ان کو یہ حق حاصل ہے، جیسا کہ دلائل کے ساتھ اور پر عرض کیا گیا، تو لازماً یہ حق بھی ان کے لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ زکوٰۃ کے مال اکٹھے کرنے، ان کے حساب کتاب رکھنے، ان کے لانے اور لے جانے، ان کے محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے، ان کے مصارف میں ان کے صرف کرنے پر، نیز اس مقصد کے لیے دعوت و تبلیغ پر جو کچھ وہ خرچ کرینگے وہ سب اس مدرسے دیا جاسکتا ہے۔

مؤلفۃ القلوب | ابن کثیر نے مؤلفۃ القلوب کی مندرجہ ذیل قسمیں گنائی ہیں:-

۱- ایسے غیر مسلم نیکو اور سوادرجن کو اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہو۔

۲- ایسے بااثر نو مسلم جن کے اسلام سے پھر جانے کا اندیشہ ہو اور جن کا ارتداد اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضر ہو سکتا ہو۔

۳- ایسے بااثر نیکو جن کی تالیف قلب ان کے ہم چشموں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں مددگار ہو سکتی ہو۔

۴- ایسے سوادرجن اپنے علاقہ میں اسلامی حکومت کو مالیہ کی وصولی میں مدد دیں اور سرحدی علاقوں کو دشمن

کے خطرات سے محفوظ رکھنے میں حکومت کا ہاتھ بٹا میں۔

ایسے نو مسلم یا غیر مسلم سوادرجن کو اسلام کے حق میں ہموار کرنے یا جن کو اسلام پر ثابت قدم رکھنے کے لیے

صدر اول میں اسلامی بیت المال سے بھاری بھاری رقمیں دی گئی ہیں، ابن جوزی کے بیان کے مطابق تقریباً

پچاس ہیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام امام شوکانی نے نیل الاوطار میں بھی گنائے ہیں جن کو خود نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے سو سواونٹ دلائے۔ ہم یہ نام یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کس کس طرح کے

سوادرجن قبائل اور اثرات خاص مؤلفۃ القلوب کے زمرہ میں شامل رہے ہیں اور یہ زکوٰۃ کی مدد سے عظیم پانے

کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں۔

صاحب نیل الاوطار نے جن ناموں کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہیں:-

ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ، عیینہ بن حصن، اقرع بن حابس، عباس بن مرداس، علقمہ بن علاثہ۔
ابن کثیر نے زید الخبیر کا نام بھی اس فہرست میں شامل کیا ہے۔ جو لوگ اس دور کی تاریخ سے واقف ہیں وہ
جانتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جو اسلام کی تاثیر سے نہیں بلکہ اسلام کی قوت سے مرعوب ہو کر
اس کے مطیع ہوئے تھے۔ بلکہ ان میں سے صفوان بن امیہ کو تو کفر پر باقی رہتے ہوئے حضور نے بڑے بڑے
عطیے دیئے، یہاں تک کہ خود ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ حنین کے موقعہ پر حضور نے مجھے دیا اور اس وقت میرے
نزدیک آپ سے زیادہ کوئی دوسرا مبغوض نہ تھا، لیکن آپ برابر دیتے رہے یہاں تک کہ پھر آپ سے زیادہ
میرے نزدیک کوئی دوسرا محبوب نہیں رہا۔

مذکورہ ناموں اور مذکورہ مقاصد پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خرچ ایک بالکل پولیٹیکل
خرچ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو، جو سیاسی اہمیت اور پولیٹیکل اثر و اقتدار رکھتے ہیں، اسلام اور
اسلامی حکومت کے حق میں ہموار کیا جائے اور اگر وہ اسلام کے اندر کسی نوعیت سے سہی، داخل ہو چکے ہیں تو
ان کو اسلام پر مضبوط کیا جائے۔

احناف کے نزدیک اسلام کے غلبہ و اقتدار کے نمایاں ہو جانے کے بعد یہ مدساقط ہو گئی۔ لیکن یہ بات کسی
پہلوؤں سے کمزور معلوم ہوتی ہے۔

اول تو جس واقعہ سے وہ اس کے سقوط پر استدلال کرتے ہیں اس سے زیادہ سے زیادہ صرف یہ ثابت ہوتا
ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے ایک خاص علاقہ کے سرداروں کو غلبہ اسلام کے بعد ان رعایتوں سے محروم
کر دیا جو انہیں بطور نائبین فکوب کے حاصل تھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی علاقہ میں اسلامی حکومت اتنی مضبوط
ہو چکی ہے کہ اسے اس طرح کے کسی پولیٹیکل خرچ کے سہارا لینے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے تو وہ اس کو
خواہ مخواہ کیوں جاری رکھے گی؟ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ اب کہیں بھی اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے
یا کبھی بھی اس کی ضرورت نہیں پیش آسکتی ہے۔

دوم یہ کہ اگر یہ مداساں لیے ساقط قرار دی گئی تھی کہ اس وقت اسلام کو پورا غلبہ حاصل ہو گیا تھا تو اب

اس زوال اور مسلمان حکومتوں کے اس ضعف کے دور میں اس کو از سر نو بحال ہو جانا چاہیے کیونکہ اس دور میں تو شاید ہی کوئی مسلمان حکومت ایسی ہو جو اپنے حق میں دوسروں کو رام کرنے اور خود اپنوں کو اپنے حق میں ہموار رکھنے کی ضرورت سے بالکل مستغنی ہو۔

سوم یہ کہ کوئی حکومت خواہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائے، لیکن وہ اس قسم کے پوسٹیکل خرچ سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتی۔ امریکہ اور روس جیسی حکومتیں بھی آج اس بات کی محتاج ہیں کہ دوسروں کو اپنے اور اپنے نصب العین کے حق میں ہموار رکھنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کریں پھر آج اگر ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت قائم ہوتی تو کس طرح اس چیز سے مستغنی رہ سکے گی۔ البتہ اگر فرق ہو گا تو یہ فرق ہو گا کہ اسلامی حکومت یہ سب کچھ دین حق اور کلمہ حق کی سر بلندی کے لیے کرے گی اور یہ حکومتیں یہ سب کچھ کلمہ کفر کی سر بلندی کے لیے کرتی ہیں۔ چنانچہ دوسرے علماء اور ائمہ یہی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔

ابو عبید کتاب الاموال میں حقیقہ کے نقطہ نظر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

واما ما قال الحسن وابن شہاب
فعلی ان الامر ما من ابداً وهذا
هو القول عندی لان الایة محكمة
لانعلم لها ناسخاً من کتاب ولا
سنة فاذا كان قوم هذه حالهم لا رغبة لهم
فی الاسلام الا للنیل وكان فی ردتهم ومحاربتهم
ضرر علی الاسلام لما عندهم من العزو
المنعة، فرای الامام ان یرضخ لهم من
الصدقة فعل ذالك لخالل ثلاث: احداً من
الاخذ بالکتاب والسنة والثانية البقیة علی
المسلمین، والثالثة انه لیس بیا یس عنهم

اور یہ جو حسن اور ابن شہاب نے کہا ہے تو انہوں نے یہ پیش نظر رکھا کہ کہا ہے کہ یہ حکم ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور یہی قول ہمارا بھی ہے۔ کیونکہ یہ آیت محکم ہے، قرآن یا سنت سے اس کے منسوخ ہونے کا کوئی ثبوت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ جب ایسے لوگ موجود ہوں جن کا اسلام کی طرف میلان صرف مال کے لیے ہو اور ان کے ارتداد یا ان سے جنگ کی صورت میں بھی ان کی طاقت و قوت کے سبب سے اسلام کے لیے خطرہ ہو تو ایسی صورت میں اگر اسلامی حکومت صدقہ کی مدد سے ان کی دلجوئی کرے تو تین وجوہ سے وہ ایسا کر سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسا کر کے کتاب و سنت کے ایک حکم کی تعمیل کرے گی، دوسری یہ کہ اس میں مسلمانوں کی ہمدردی ہے،

ان تمامی بھرا الاسلام ان یفقہوا و تخسن
فیہم رغبتہم۔

رکاب الاموال ص ۶۷

یہی نقطہ نظر صاحب نیل الاوطار کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

والظاهر جواز التالیف عند الحاجة
الیہ۔ فاذا کان فی زمن الامام قوم لا
یطیعونہ الا للدنیا ولا یقتدوا علی
ادخالہم تحت طاعته بالقتل والغلب
فلہ ان یتالفہم ولا یكون لفتوا الاسلام
تاثیر لاند لہم نیفیع فی خصوص ہذا
الواقعة۔

نیل الاوطار - ج ۴ ص ۱۷۷

یہی رائے علامہ ابن خزم نے محلی میں ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

وادعی قوم ان سہم المولفة قلوبہم قد
سقط قال ابو محمد وهذا باطل؛ بل ہر
ایوم اکثر ما کانوا وانما یسقطون ہم و
العاملون اذ اتوا فی المرقسمة صدقة نفسه
لانہ لیس ہناک عاملون علیہا، وامر
المولفة الی الامام لا الی غیرہ۔

المحلی - ج ۶ ص ۱۲۵

قبیری یہ کہ وہ یہ توقع کر سکتی ہے کہ اگر ان لوگوں کو کچھ عرصہ
اسی طرح اسلام پر قائم رکھا جاسکا تو کیا عجب وہ اسلام
کو سمجھنے لگیں اور دل سے اس کو قبول کر لیں۔

اور ظاہر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ضرورت داعی ہو تو مال
کے ذریعہ سے پرچانا جائز ہے۔ اگر حکومت اسلامی کو ایسے
لوگوں سے سابقہ ہو جو مال کے بغیر اطاعت کرنے پر راضی
نہ ہوں اور خبر و نور کے ذریعہ سے ان کو زیر اطاعت لانے
کی قدرت نہ ہو تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ مال کے ذریعہ
سے ان کی تالیف قلب کرے۔ اور اسلام کے غلبہ کا اس امر
پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کیونکہ مذکورہ صورت میں تو صاف
واضح ہے کہ وہ کچھ مؤثر نہیں ہے۔

اور ایک گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ مولفۃ القلوب کی مدد ساقط
ہوتی ہے اور ابو محمد ابن خزم کا کہنا یہ ہے کہ آج وہ پہلے
سے بھی کہیں زیادہ موجود ہیں۔ مولفۃ القلوب اور عاملین کی
مددیں تو اس وقت ساقط ہونگی جب ہر شخص اپنے اپنے صدقہ
وزکوٰۃ کی تقسیم کی ذمہ داری خود سنبھال لے کیونکہ اس صورت
میں عاملین سرے سے ہونگے ہی نہیں اور مولفۃ القلوب کا
معاملہ تمام تر اسلامی حکومت سے متعلق ہے، افراد سے
اس کا تعلق ہی نہیں ہے۔

ان احوال سے صاف ظاہر ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی مد جس طرح پہلے ضروری تھی اسی طرح اب بھی ضروری ہے اور اس مد پر زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جاسکتا ہے۔

البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جس طرح ایک اسلامی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ صدقات اور زکوٰۃ کی آمدنی سے اس خالص پولیٹیکل مقصد پر خرچ کرے اسی طرح اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں دینی اداروں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے اس کو صرف کریں؟ اس بارہ میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ ایک خالص پولیٹیکل خرچ ہے جس کی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونا ایک حکومت ہی کے لیے ممکن ہے۔ اس وجہ سے پبلک اداروں اور اجتماعوں کو اپنے تصرفات اسی حد تک محدود رکھنے چاہئیں جس حد تک محدود رکھنے کا انہوں نے اظہار و اعلان کیا ہے اور جس دائرہ کے اندر خرچ کرنے کے لیے زکوٰۃ ادا کرنے والوں نے ان پر اعتماد کیا ہے۔ صرف بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی جگہ کے مسلمان باہل کفر و ابدل کفر کے زیر اثر آگئے ہوں اور وہ محسوس کرتے ہوں کہ مال خرچ کر کے بعض مسلمانوں کو کفر کے لیے استعمال ہونے سے بچایا جاسکتا ہے یا اس کے ذریعہ سے مخالفین کو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی سے روکا جاسکتا ہے تو اس مقصد کے لیے زکوٰۃ کے مال میں سے بھی وہ خرچ کر سکتے ہیں۔

نی الرقاب | فی الرقاب سے مطلب یہ ہے کہ غلاموں کے آزاد کرنے پر بھی زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اب غلامی کا مشد ختم ہو چکا ہے لیکن قرآن کے نزول کے وقت یہ مسئلہ موجود تھا اس وجہ سے ایک اہم انسانی خدمت کے پہلو سے ان کی اعانت اور ان کی آزادی کو بھی زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف قرار دیا گیا۔

اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس سے مراد ہر طرح کے غلام ہیں یا صرف وہ غلام مراد ہیں جو اپنے آقاؤں سے ایک متعینہ رقم کی ادائیگی کی شرط پر اپنی آزادی کا اقرار حاصل کر لیتے ہیں، جن کو اصطلاح میں مکاتب کہتے ہیں۔ احناف اور شوافع کے نزدیک اس سے صرف مکاتب مراد ہیں۔ لیکن ابن عباس، حسن بصری، امام مالک، امام احمد بن حنبل، ابو ثور، ابو عبیدہ اور امام بخاری وغیرہ کے نزدیک یہ دونوں قسم کے غلاموں کے لیے عام ہے۔ ان کے نزدیک صدقات کی رقم سے ایک غلام کو خرید کر آزاد کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مکاتب

کی اعانت کے مقابل میں اولیٰ و افضل ہے۔ لیکن اصناف اور شوافع کے نزدیک صدقات کی مد سے مکاتب کی اعانت تو کی جاسکتی ہے لیکن کسی غلام کو مستقلاً خرید کر آزاد نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے اس معاملہ میں امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا مذہب زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ اول تو اس سبب سے کہ اس بخت میں سارا مذاہب سخن حرف لام پر ہے، تھوڑی دیر کے لیے مان بھیجے کہ وہ تملیک ہی کے مفہوم کے لیے خاص ہے لیکن سوال یہ ہے کہ الرقاب پر وہ کہاں داخل ہے۔ یہاں سے تو اب فی کا دخل شروع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد جتنے مصادر بیان ہوئے ہیں سب فی ہی کے تحت ہیں۔ فی کے متعلق یہ دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے اندر بھی تملیک کے مفہوم کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس کے اندر تو جیسا کہ اوپر گزرا مصلحت، مفاد اور بہبود کا مفہوم پایا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہوتے کہ زکوٰۃ غلاموں کی بہبود اور ان کو آزاد کرنے کے لیے صرف کی جاسکتی ہے، قطع نظر اس سے کہ تملیک پائی جائے یا نہیں۔ ثانیاً یہ کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ تملیک کا مفہوم فی کے اندر بھی گھسا ہوا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم ایک غلام کو اس کے مالک سے خرید کر آزاد کر دیتے ہیں تو اس میں تملیک کیوں نہیں پائی جاتی؟ اگر ایک مسکین کو زکوٰۃ کے پیسوں سے دعویٰ خرید کر دے دیں تو اس صورت میں تملیک پائی جائے گی یا نہیں۔ اسی طرح اگر ایک شخص کو ہم اس کی آزادی خرید کر اس کے حوالہ کر دیتے ہیں تو آخر تملیک کیوں نہیں پائی گئی؟ یہ ہم نے اس مفروضہ پر عرض کیا ہے کہ تملیک کا مفہوم فی کے اندر بھی لے لیا جائے۔ لیکن ہمارے نزدیک، جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ صحیح نہیں ہے۔ فی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ صدقات و زکوٰۃ غلاموں کی بہبود اور ان کی آزادی کی مہم میں صرف کیے جاسکتے ہیں۔ اگر کوئی مکاتب اپنی مکاتبت کی رقم ادا کرنے کے لیے اعانت کا طالب ہے تو آپ اس کو بھی دے سکتے ہیں اور اگر آپ خود کسی غلام کو خرید کر اس کو آزاد کرنا چاہیں تو یہ بھی بے تکلف کر سکتے ہیں۔ بلکہ اگر خدا نخواستہ کسی جنگ کے نتیجے کے طور پر دنیا میں پھر غلامی کا مسئلہ پیدا ہو جائے اور خدمت انسانیت کے نصب العین کو سامنے رکھ کر ایسی انجمنیں قائم ہوں جو ان غلاموں کی آزادی اور ان کی سود و بہبود کے لیے وسیع پیمانہ پر تحریک چلائیں تو اس تحریک پر بھی صدقات و زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ چونکہ مستقلاً کسی غلام کو آزاد کرنے کی صورت میں اس کا حق بولا اس کے آزاد کرنے والے کو حاصل ہو گا اور یہ خود اپنی زکوٰۃ سے ایک قسم کے اتقاع کی شکل ہوئی، اس وجہ سے اس کو ناجائز ہونا چاہیے۔ لیکن میرے نزدیک یہ شبہ کچھ ذرا نہیں ہے۔ اول تو یہ اعتراض اس صورت میں سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا جبکہ کوئی اسلامی حکومت یا پبلک ادارہ زکوٰۃ کے فنڈ سے کسی غلام کو خرید کر آزاد کرے کیونکہ اس صورت میں اس آزاد کردہ غلام کا اول عام مسلمانوں کو حاصل ہو گا جو شخصی اتقاع کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ ثانیاً زکوٰۃ یا اس طرح کی کسی چیز سے وہ شخصی اتقاع ناجائز ہے جس کو پیش نظر رکھ کر ہی زکوٰۃ دی جائے یا وہ کام کیا جائے۔ اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ زکوٰۃ تو دی جائے اس کے اصل مقصد کو سامنے رکھ کر، لیکن اس کے نتیجہ میں زکوٰۃ دینے والے کو کوئی فائدہ حاصل ہو جائے تو اس کے سبب سے اس کا یہ کام ناجائز نہیں ہو گا۔ اگر ایک شخص حج اس لیے کرتا ہے کہ وہ عرب کی سیاحت کرنا چاہتا ہے تو اس کا حج بلاشبہ نہیں ہو گا لیکن اگر وہ حج، حج کے ارادہ سے کرتا ہے اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اسے حجاز کی سیاحت کا بھی موقع مل جاتا ہے تو آخر اس سے اس کا حج کیوں باطل ہو جائے گا؟

غاریین زکوٰۃ و صدقات، کا مال غاریین کی امداد میں بھی خرچ کیا جاسکتا ہے غاریین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی کاروباری ادارہ یا سماج کی نامساعدت کے سبب سے قرضے نیچے دب گئے ہوں۔ یا کسی آفت ارضی و سماوی نے ان کے گلہ، یا باغ، یا کھیتی، یا سرمایہ، یا کاروبار کو تباہ کر دیا ہو۔ یا انہوں نے اصلاح ذات البین کے ارادہ سے دوسروں کی کوئی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہو۔

اس طرح کے لوگوں کی امداد اس نقطہ نظر سے کی جائے گی کہ یہ معاشرہ کے کماؤ اور قابل افراد ہیں، ان کو گرنے اور تباہ ہونے سے بچایا جائے تاکہ یہ جس چکر میں آگئے ہیں اس سے نکل کر پھر اپنی صلاحیتوں سے قوم اور معاشرہ کو بہرہ مند کر سکیں۔ ان کی امداد ان کے فقر یا ان کی مسکنت کی بنا پر نہیں کی جائے گی۔ اگر اس بنا پر کسی جانی ہمتی تدارک کا ذکر ایک مستقل عنوان سے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پھر تو یہ فقر اور مساکین کے زمرہ میں آپ سے آپ آجاتے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کی احتیاج کے ناپنے کا پیمانہ اس سے بالکل مختلف ہو گا جو فقر اور مساکین کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ اس کے دلائل ملاحظہ ہوں۔

کتب عمر بن عبدالعزیز ان اقضوا عن
الغارمین فکتب الیہ انا نجد الرجل له
المسکن، والخادم، والفرس، والاثاث ذکتب
عمر انه لا یبدل للمراء المسلم من مسکن یشکده،
وخادم یشکده، وفرس یشکده، وینا
عدوه ومن ان یشکده له الاثاث
فی بیتہ نعم فاقضوا عنه

(کتاب الاموال ص ۵۵۶)

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال کو یہ فرمان لکھا کہ
زیر باعد کے قرضے ادا کیے جائیں۔ ان کے عمال کی جانب
سے ان کو یہ اطلاع دی گئی کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے
پاس مکان موجود ہے، نوکر موجود ہے، گھوڑا موجود ہے۔
مگر میں فرخچر ادا تا نہ موجود ہے۔ کیا ایسے لوگوں کے قرضے
بھی اتارے جائیں؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں
لکھا کہ ایک مسلمان کے لیے ایک مکان جس میں وہ رہ سکے،
ایک نوکر جو اس کا ہاتھ بٹا سکے، ایک گھوڑا جس پر وہ اپنے
دشمن سے مقابلہ کر سکے اور گھر میں کچھ مرد سامان تو ناگزیر
چیزیں ہیں۔ اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ہاں، ان لوگوں
کے قرضے بھی ادا کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عمال کو یہ شبہ ہوا تھا کہ غارمین جب تک فقر کی اس حد
کو نہ پہنچ جائیں جو فقراء و مساکین کے لیے مقرر ہے اس وقت تک صدقات کی مدد سے ان کے قرضے یا ان
کی ذمہ داریاں نہیں ادا کی جاسکتی ہیں۔ لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے جواب سے یہ بات صاف کر دی
کہ اس طریقہ کا صرف فقر دور کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کو اٹھانا مقصود ہے۔ اس وجہ سے اس کی
احتیاج کو اس پیمانہ سے نہ ناپو جس پیمانہ سے فقراء و مساکین کی احتیاج کو ناپتے ہو۔

اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد عدلت گستر میں اپنے عمال کو یہ حکم دیا تھا کہ

اغطوا من الصدقة من البقت له
اسنة غنما ولا تعطوها من البقت له السنة
غنمیں - (کتاب الاموال ص ۵۵۸)

صدقہ کے مال سے ان کی مدد کرو جن کا قحط سے صرف
ایک ریوڑ بچ رہا ہو۔ ان کی مدد نہ کرو جن کے پاس دو
ریوڑ بچ رہے ہوں۔

روایت میں لفظ غنم کا ہے۔ غنم سے مراد بکریوں کا ایک ریوڑ ہوتا ہے جو کم و بیش سو بکریوں پر مشتمل

ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سو بکریاں اس صدقہ حاج سے بہت زیادہ ہیں جن میں آدمی زکوٰۃ کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اتنی بکریوں کی موجودگی میں تو اس سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے لیکن اگر قحط یا کسی دوسری آفت کے سبب سے کسی کا گلہ تباہ ہو جائے اور اس کے پاس صرف سو بکریاں بچ رہیں تو وہ بحیثیت ایک غلام کے مستحق ہے کہ حکومت اسلامی صدقات کے فنڈ سے اس کو سہارا دے تاکہ وہ اپنے کاروبار کو سنبھالے رکھ سکے۔ جو شخص محض اس بنا پر غلام کے حکم میں آجاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے آپس کے کسی جھگڑے کو چکانے کی خاطر کوئی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے تو اس کی غربت و امارت کا تو کوئی سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک امیر کبیر ہوتے ہوئے بھی ایک غلام ہے اور مستحق ہے کہ اپنی اٹھالی ہوئی اس ذمہ داری سے عہدہ برکاء ہونے کے لیے صدقات و زکوٰۃ سے امداد پائے۔

امام شوکانی لکھتے ہیں :-

”اہل عرب کا حال یہ تھا کہ جب ان کے درمیان کوئی ایسا جھگڑا برپا ہوتا جو دیت وغیرہ کے قسم کے کسی مالی مطالبہ پر مبنی ہوتا تو کوئی شخص اٹھتا اور جھگڑے کو چکانے کے لیے محض بئذنی اللہ اس ذمہ داری کو اپنے سر لے لیتا اور جھگڑا ختم ہو جاتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ چیز مکارم اخلاق میں شامل ہے۔ جب لوگوں کو تپہ چلتا کہ کسی شخص نے اس طرح کی کوئی ذمہ داری اٹھالی ہے تو اس کی امداد کے لیے سبقت کرتے، یہاں تک کہ وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا۔ اور اگر اس مقصد کی خاطر اس کو لوگوں سے سوال کرنے کی نوبت آتی تو یہ چیز اس کی عزت میں کوئی کمی نہ کرتی بلکہ اس کے لیے وجہ فخر ہوتی“

ذیل الاوطار ج ۴ ص ۱۶۹

یہ ایک چیز اس میں دیکھنے کی ہے، وہ یہ کہ ایک شخص فی الواقع کسی ارضی و سماوی آفت یا کسی واقعی آوار پڑھاؤ کی زد میں آکر زیر بار ہوا ہے یا محض اپنی مشیخت اور اپنے اسراف یا اپنے شوق قسمت آزمائی کا شکار ہوا ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو وہ غلام ہے اور زکوٰۃ کے فنڈ سے مدد پانے کا مستحق۔ لیکن اگر دوسری صورت ہو تو اس کی حوصلہ افزائی کم از کم زکوٰۃ و صدقات کی مدد سے نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ یہ چیز بہتوں کو غلط راہ پر ڈال دے گی۔

فی سبیل اللہ | فی سبیل اللہ ایک وسیع مفہوم رکھنے والی اصطلاح ہے جس کے اندر نیکی اور بھلائی کے وہ سارے کام داخل ہیں جن کی طرف اللہ اور اس کے رسولؐ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اس کی مقابل اصطلاح فی سبیل الطاغوت ہے جس سے مراد وہ پورا نظام ضلالت ہے جو شیطان نے بچھا رکھا ہے۔ اس تقابل کی روشنی میں غور کیجیے تو یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ سبیل اللہ سے مراد وہ پورا نظام ہدایت بحیثیت مجموعی بھی ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اور اس کے الگ الگ اجزاء بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔ اگر بحیثیت مجموعی اس پورے نظام کے قیام و بقا اور اس کی حفاظت اور اس کے استحکام پر صدقات و زکوٰۃ کی مدد سے خرچ کیا جائے جب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور اگر اس کے کسی ایک ایسے ہی جز کی حفاظت و ترقی پر اس کو صرف کیجیے جب بھی وہ فی سبیل اللہ ہے۔

اتفاق اور جہاد بالمال کے تعلق کے ساتھ جہاں جہاں فی سبیل اللہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے ہم اس کی بعض مثالیں یہاں قرآن مجید سے نقل کرتے ہیں تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے کہ اس اصطلاح کے تحت کیا کیا چیزیں آسکتی ہیں۔

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ - (لقمہ - ۱۹۵)

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد باسیف ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت اور خانہ کعبہ کو کفار کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے جاری تھا۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ - (لقمہ - ۲۶۱)

ان لوگوں کے خرچ کی مثال جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ اگائے سات بالیاں۔

یہاں فی سبیل اللہ سے مراد عام مصارف خیر ہیں جن میں نیکی اور بھلائی کے سارے کام داخل ہیں۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَمْ يَلْبَسُوا مَا انْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى

جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنا مال اللہ کے راستے میں اور اس خرچ کے پیچھے اظہار احسان اور ایذا کی بلا نہیں

لگا دیتے۔

(بقرہ-۲۶۲)

مذکورہ آیت میں جی فی سبیل اللہ سے فقراء اور مساکین اور اس طرح کے دوسرے مستحقین مراد ہیں۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أَحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ - (بقرہ-۲۶۳)

ان فقراء کے لیے خرچ کیا جائے جو اللہ کی راہ میں بندھ گئے ہیں اور زمین میں ہاتھ پاؤں نہیں مار سکتے۔

اس آیت میں سیاق کلام سے واضح ہے کہ فی سبیل اللہ سے دین اور علم دین مراد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ

جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنا مال اس لیے خرچ کرتے ہیں

لِيَبْذُلُوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (انفال-۳۶)

کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکیں۔

یہاں سبیل اللہ سے مراد اسلام بحیثیت مجموعی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا

بے شک جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور

بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (انفال-۴۰)

مجان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

یہاں فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے مراد اقامت دین کی جدوجہد بحیثیت مجموعی ہے۔

اسی طرح ابوداؤد کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج بھی فی سبیل اللہ میں شامل ہے۔

فَان الْحج من سبیل اللہ -

مذکورہ بالا استعمالات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کے اندر نیکی اور نیک سارے ہی

کام داخل ہیں۔ اگر یہ لفظ تنہا بولا جائے تو اس سے خیر کا کوئی خاص کام بھی مراد ہو سکتا ہے اگر موقع کلام کسی

خاص چیز کو متعین کر دے۔ اور پورا دین بھی اس سے مراد ہو سکتا ہے اگر موقع عمومیت کا ہو۔ ازاں اگر نیکی اور

بھلائی کے چند متعین کاموں کے ساتھ اس کا ذکر آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان خاص خاص کاموں کے

بعد اس جامع اصطلاح نے بقیہ دوسرے دین کے سارے کاموں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ یہ میں نے

جو کچھ عرض کیا ہے بعینہ یہی بات دوسرے محقق علماء نے بھی لکھی ہے۔

علامہ آلوسی حنفی اپنی تفسیر روح المعانی میں فی سبیل اللہ کی تفسیر کے تحت حنفیہ کا مسلک نقل کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:

قیل المراد طلبية العلم واقتصر
عليه في الفتاوى الظهيرية وفسره
في البدائع بجميع القرب فيدخل
فيه كل من سعى في طاعة الله تعالى
وسبل الخيرات۔

تفسیر روح المعانی ج ۱۰ ص ۱۱۰

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد طالب علم ہیں اور فتاویٰ ظہیریہ
میں اس مد کو طلبہ ہی تک محدود کر دیا گیا ہے۔ لیکن
البدائع والصنائع میں اس کی تفسیر لہجوں کی گئی ہے کہ اس
میں نیکی اور قرب الہی کے ساتھ ہی کام داخل ہیں تو جو
شخص بھی اللہ کی اطاعت اور بھلائی کے کاموں میں
جدوجہد کرے گا وہ اس میں شامل ہوگا۔

ابن عربی احکام القرآن میں امام مالک رحمہ اللہ علیہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قال مالك سبل الله كثيرة - احمد
واسحق قال انه الحج والذى يصح عندي
من قولهما ان الحج من جملة السبل مع
الغزو۔

فی سبیل اللہ کے متعلق امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ
اللہ کے راستے بہت سے ہیں۔ امام احمد اور اسحاق کا
قول یہ ہے کہ اس مراد حج ہے لیکن میرے نزدیک ان کے
قول کا صحیح منشا یہ ہے کہ حج بھی جہاد کی طرح اللہ کے
ماستوں میں سے ایک راستہ ہے۔

تفسیر کبیر اور تفسیر خازن میں فی سبیل اللہ کے تحت، یہ قول ملاحظہ فرمائیے۔

واعلم ان ظاهر اللفظ في قوله وفي
سبيل الله لا يوجب القصر على الغزاة
فلهذا المعنى نقل الفقهاء في تفسيره عن
بعض الفقهاء انهما جازوا صرف
الصدقات الى جميع وجوه الخير من
تكفين الموتى او بنا الحصون وعمارته
المساجد لان قوله وفي سبيل الله عام
في الكل۔ (تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۶۲ و خازن ج ۲ ص ۲۶۲)

فی سبیل اللہ کے ظاہر الفاظ اس بات کو لازم نہیں کرتے
کہ اس مد کو تمام تر مجاہدین کے لیے خاص کر دیا جائے۔ اسی
وجہ سے فقہان نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء کے متعلق یہ
نقل کیا ہے کہ وہ صدقات کو تمام مصارف خیر، مثلاً
مردوں کی تجہیز و تکفین، قلعوں کی تعمیر، مساجد کی
تعمیر۔۔۔ پر خرچ کرنا جائز قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ فی سبیل اللہ
کے الفاظ ان تمام چیزوں پر حاوی ہیں۔

علامہ ابن خزم مٹھی میں فی سبیل اللہ کے تحت یہ فرماتے ہیں :-

فلنا نعمہ وکل فعل خیر فهو من سبیل اللہ تعالیٰ - (ج ۶ - ص ۱۵۱)

ہم کہتے ہیں ہاں، نیکی اور بھلائی کا ہر کام فی سبیل اللہ کے تحت داخل ہے۔

اس دور آخر کے مشہور سلفی عالم علامہ رشید رضا مرحوم اپنی تفسیر المنار میں فی سبیل اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

وفی سبیل اللہ وهو لیشتمل سائر المصالح الشرعية العامة ہی ملاک امراء دین و الدولة واولہا واولیہا بالتقدیم الاستعداد للحرب لبشر السلاح واعدیة الحیند و لاوات النقل و تجهیز الغزاة و تقدم مثله عن محمد بن الحکیم - (تفسیر المنار - ج ۱ - ص ۵۰۵)

فی سبیل اللہ کے الفاظ ان تمام شرعی مصالح پر مشتمل ہیں جن پر مذہب اور حکومت کا انحصار ہے۔ ان میں سب سے اول اور سب پر مقدم یہ ہے کہ جنگ کی تیاری کے لیے اسلحہ خریدے جائیں، فوج کے لیے غذائی سامان فراہم کیا جائے، ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے، مجاہدین کو سامان حرب سے لیس کیا جائے۔ اسی طرح کا قول محمد بن حکم سے مروی ہے۔

ہمارے ملک کے بلند پایہ عالم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اپنی شہرہ آفاق کتاب میرۃ النبی میں فی سبیل اللہ کے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں :-

”فی سبیل اللہ کا وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے“

(سیرت - ج ۵ - ص ۱۷۶)

ذکوۃ بالا اقوال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کی مد ایک وسیع مد ہے۔ اس میں نیکی اور بھلائی کے سارے ہی کام داخل ہیں۔ اسلام کی دینی و دنیاوی مصلحت کی کوئی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جو اس کے اندر سمٹ نہ آئی ہو۔ اس میں کسی پہلو سے تملیک کا بھی کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ اول تو یہاں کوئی چیز ایسی ہے نہیں جس سے تملیک کا مفہوم اخذ کیا جاسکے، دے دے کر ایک لام تھا لیکن اس کی جگہ پر بھی، جیسا کہ عرض کیا گیا، یہاں فی ہے جس کے اندر تملیک کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ثانیاً اگر

اس کے تحت تمام مصارف خیر آتے ہیں، جیسا کہ ہر مسلک کے علماء اور ائمہ نے تصریح کی ہے تو تمبیک شخصی کا تو ان ساری صورتوں میں پایا جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر ممکن ہے تو تمبیک اجتماعی کا پایا جانا ممکن ہے اور اس سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔ پس اگر بالفرض کسی چیز کے جواز میں اس پہلو سے کسی کو تردد ہے کہ لطفقراد کی لام کے یہ منافی ہے تو اس کو چھوڑ بیٹے، یہ دیکھیے کہ وہ فی سبیل اللہ کی مدد کے تحت آتی ہے یا نہیں؛ اگر آتی ہے تو اس کے جواز کی یہ دلیل کافی ہے۔

ابن السبیل | ابن السبیل سے مراد مسافر ہے۔ مسافرت بجائے خود ایک ایسی حالت ہے جو بجا طور پر آدمی کو مدد کی محتاج اور مستحق بنا دیتی ہے۔ ایک اور سطر درجہ کا آدمی بھی جو اپنے شہر میں ایک کھانا پتیا آدمی شمار ہوتا ہے اگر کسی سفر پر مجبور ہو جائے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ ہر جگہ اپنی ساری ضروریات خود پوری کر سکے۔ یہ تو صرف تھوڑے سے مالداروں ہی کے لیے ممکن ہے کہ وہ جہاں بھی جائیں اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں ٹھہریں، ٹیکسیوں میں گشت کریں اور اگر بیمار پڑ جائیں تو اپنے مستقر ہی پر ڈاکٹر بلا کر علاج کرائیں۔ ایک عام آدمی، اگرچہ وہ محتاج اور فقیر کی تعریف میں نہ آتا ہو، سفر میں اپنی ساری ضروریات اگر خود اپنے جیب کے بل پر پوری کرنی چاہے تو یہ اس کے لیے ناممکن ہو گا۔ وہ تو بہر حال مجبور ہو گا کہ اگر رات گزارنی ہو تو کسی مسافر خانہ یا مراٹھے کا تپہ معلوم کرے، اگر بیمار ہو جائے تو کسی خیراتی شفا خانہ میں داخل ہونے کی کوشش کرے اور اگر ڈاکٹر نہ ہو تو کاکوٹی رعایتی یا مفت ذریعہ ہاتھ آجائے تو اس سے نانڈہ اٹھائے۔ اگر وہ یہ کچھ نہ کرے گا تو اس کے لیے کسی لمبے سفر کے مصارف کا یا راٹھانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس وجہ سے شریعت نے اس کو عام معنوں میں محتاج نہ ہونے کے باوجود صدقات و زکوٰۃ سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا ہے۔ ابن کثیر نے البوداؤد کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تغفل
الصدقة لغنى الا في سبيل الله و ابن السبيل
او جار فقير فيهدى لك او يدعوك
(ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی غنی کے لیے
صدقہ جائز نہیں ہے مگر تین صورتوں میں، وہ اللہ کی راہ میں
ہو، یا مسافر ہو، یا کوئی غریب پڑوسی ہو جو صدقہ کے مال
میں سے تمہارے لیے ہدیہ بھیجے یا کھانے پر بلائے۔

اس وجہ سے یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ صرف انہی مسافروں کو صدقات سے استفادہ کا مستحق سمجھا جائے جن کا کرایہ تھر گیا ہو یا جن کا اونٹ مر گیا ہو بلکہ عام مسافروں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔ بلکہ تملیک شخصی کی پابندی نہ باقی رہنے کی صورت میں تو بہتر شکل مسافروں کو فائدہ پہنچانے کی یہ ہے کہ تمام ایسی مرکزی جگہوں پر جہاں ہر طبقہ کے مسلمان جمع ہونے پر مجبور ہوتے ہوں اور تمام ایسے شہروں میں جن میں عموماً باہر کے مسلمان آمد و رفت رکھتے ہوں، مسافروں کی سہولت اور آسائش کے لیے مسافر خانے اور باطین بنائی جائیں جہاں اس امر کا بھی اہتمام ہو کہ ان کے پیش نظر مقصد کے لحاظ سے ضروری معلومات فراہم کی جاسکیں، ان کی ڈاک اور تار کا اہتمام ہو، اور ضرورت کے مطابق ان کے لیے طبی امداد بھی بہم پہنچ سکے۔ مکہ، مدینہ منیٰ اور جدہ میں عینی اس کی ضرورت ہے اس سے قطع نظر کیا کراچی، لاہور، پشاور اور اس طرح کے دوسرے شہروں میں مسافروں کے لیے اس طرح کی سہولتیں فراہم کرنے کی شدید ضرورت نہیں ہے؛ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسافر لیا اوقات اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں لیکن ہمارے کسی شہر میں بھی ایسے ادارے موجود نہیں ہیں جو مسافروں کو ان کی مطلوبہ سہولتیں بہم پہنچانے کے ذمہ دار ہوں۔

ابو عبید نے کتاب الاموال میں انس بن مالک اور حسن بصری کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ

قالا ما اعطيت في الجسوس والطرقت ان دونوں کا یہ قول ہے کہ پلوں اور راستوں کی تعمیر میں جو

فہمی صدقہ ماضیہ - (کتاب الاموال ص ۵۷۲) کچھ تم نے دیا وہ بھی صدقہ ادا شدہ ہے۔

مکان ہے ان بزرگوں نے اس کو فی سبیل اللہ کے تحت داخل کیا ہو لیکن بالکل مساوی ہی درجہ کا ایک

امکان یہ بھی ہے کہ وہ اس کو ابن السبیل کے تحت لائے ہوں۔

قربانی کی کھالوں کا شرعی حکم | یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ صدقات و زکوٰۃ کی معروف اقسام کو پیش نظر رکھ کر عرض کیا گیا ہے لیکن خاص قربانی کی کھالوں سے متعلق ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ کیا ان کی نوعیت بعینہ وہی ہے جو عام صدقات و زکوٰۃ کی ہے یا ان سے کچھ مختلف ہے؛ بعض واضح دلائل کی بنا پر اس عاجز کا رجحان یہ ہے کہ ان کی نوعیت صدقات و زکوٰۃ کی معروف اقسام سے بالکل مختلف ہے۔

اس اختلاف کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ زکوٰۃ کی عام طور پر جو تعریف کی جاتی ہے اس کا کوئی جز بھی

اس کے اوپر صادق نہیں آتا۔

زکوٰۃ کی تعریف عام طور پر یہ کی جاتی ہے،

نصاب مقررہ کا کوئی حصہ کسی فقیر یا اس طرح کے کسی ایسے آدمی کو دینا جس کو ویسے بدلنے میں کوئی شرعی مانع موجود نہ ہو اور یہ دینا اس طرح ہو کہ عطا کردہ مال سے دینے والے کا کوئی مفاد و البتہ نہ رہے۔

اب آئیے دیکھیے کہ اس کا کوئی جزو بھی قربانی کی کھالوں پر صادق آتا ہے؟
قربانی کی کھالیں نصاب کا کوئی جزو نہیں ہیں۔

ان کو لازماً کسی فقیر ہی کو دینا ضروری نہیں ہے، آپ خود بھی اپنی قربانی کی کھال اپنے کسی ذاتی مصرف میں لاسکتے ہیں، اپنے کسی دوست کو دے سکتے ہیں، کسی غریب اور محتاج کو دے سکتے ہیں، بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کر سکتے ہیں، بس اگر مانعت ہے تو اس بات کی ہے کہ بیچ کر اس کے دام کھرے کرنے کی فکر نہ کیجیے۔ اس کے دینے میں کسی ہاشمی یا غیر ہاشمی کے امتیاز کی کوئی وجہ بھی بظاہر نظر نہیں آتی، کیونکہ اس کے اوپر وہ لوگوں کے مال کا میل ہونے کی تعبیر کسی طرح بھی صادق نہیں آتی۔ دینے والے کا اپنا مفاد بھی اس سے منقطع ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی قربانی کی کھال کی جاننا بنا کر محلہ کی مسجد پر وقف کر دے تو اس پر وہ خود بھی نماز پڑھ سکتا ہے اور دوسرے مسلمان بھی اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اب میں مختصراً قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں سے مذکورہ باتوں کی دسیں نقل کرتا ہوں۔

جہاں تک قربانی کے گوشت کا تعلق ہے اس کا ذکر تو خود قرآن ہی میں موجود ہے کہ اس کو کھاؤ کھلاؤ اور غریبوں کو دو۔

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِيعُوا أَوْلِيَاءَ الْفُقَرَاءِ
پھر اس میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ فقیر کو بھی
(الحج) کھلاؤ۔

اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ یہ نکتہ ملحوظ رکھنے کا ہے کہ اس میں فقیر کو دینے کا ذکر آوٹا یا اقتصد کے الفاظ کے ساتھ نہیں آیا ہے بلکہ اَطِيعُوا کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیا

چلئے کہ اتنا اور تصدق کے الفاظ تملیک شخصی کے مفہوم کے لیے آتے ہیں جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے، تو کیا اطعام کا لفظ بھی تملیک شخصی کے مفہوم کا حامل ہے؛ اگر ایک شخص اپنا قربانی کا گوشت پکا کر بہت سے غریبوں کو بلا کر ایک دعوت عام کی صورت میں کھلا دے تو کیا یہ اطعام نہ ہو گا؛ حالانکہ فتح القدیر کی تصریح کے مطابق اس صورت میں تملیک نہیں پائی گئی جس کو صدقات و زکوٰۃ کی شرط لازم قرار دیا گیا ہے۔

جو حکم قربانی کے گوشت کا ہے، احادیث اور فقہاء کی تصریحات سے ثابت ہے کہ بعینہ وہی حکم قربانی کی کھالوں کا بھی ہے یعنی ایک شخص اپنی قربانی کی کھال خود اپنے کسی ذاتی مصرف میں بھی لاسکتا ہے، کسی کو ہبہ بھی کر سکتا ہے اور کسی محتاج اور غریب کو صدقہ بھی کر سکتا ہے۔ بس یہ بات ناجائز ہے کہ غنیوں اور یتیموں کی طرح اس کو بیچ کر سرمایہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔

فقہ ابن نفعان سے روایت ہے کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور آپ نے خطبہ دیا کہ میں نے تم کو یہ حکم دیا تھا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھ چھوڑا کرو، یہ حکم اس لیے دیا تھا کہ وہ تم سب کے لیے کافی ہو سکے۔ اب میں اس کو تمہارے لیے جائز کرتا ہوں۔ پس تم اس کو جس طرح چاہو برکو، البتہ بدی یا قربانی کا گوشت بیچو نہیں۔ کھاؤ، خیرات کرو اور ان کی کھالوں سے فائدہ اٹھاؤ، البتہ ان کو بیچو نہیں۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قام فقال انی کنت امرتکم ان لاتاکلوا الحوم الاضاحی فوق ثلاثۃ ايام لیسعکم۔ وانی احلہ لکم فکلوا ماشئتم ولا تتبعوا الحوم الھدی و الاضاحی وکلوا و تصدقوا واستمتعوا بجلودھا ولا تتبعوها۔ رنل الاوطار۔ ج ۵۔ ص ۱۳۷

اس حدیث سے واضح ہے کہ قربانی کے گوشت اور اس کی کھال کے مصرف میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص چاہتا ہے تو اس کو اپنے کسی ذاتی مصرف میں بھی لاسکتا ہے لیکن اس کو سرمایہ بنانے کا ذریعہ نہ بنائے بلکہ اس کو صدقہ کر دے۔

فقہاء کی تصریحات بھی اس کے متعلق یہی ہیں۔

امام شوکانیؒ مذکورہ حدیث کے تحت فرماتے ہیں:-

اور اس حدیث سے نیچے بغیر ان کھالوں سے نائدہ اٹھانے کی اجازت نکلتی ہے۔ محمد بن حسن سے مروی ہے کہ اس کھال کے بدلہ میں آدمی گھر کے لیے پھلنی یا اس طرح کی گھر لپو چیزوں میں سے کوئی چیز حاصل کر سکتا ہے۔ البتہ کھانے پینے کی کوئی چیز اس کے بدلہ میں نہ حاصل کرے۔ امام ثوری کہتے ہیں کہ اس کو نیچے نہیں، گھر کے لیے ڈول یا مشکیزہ بناے۔

وفيه ايضاً الاذن بالانتفاع بها بغير البيع وقد روى عن محمد بن الحسن ان له ان يشتري بجمسه كهاغراً بالاول او غيرها من الة البيت لاشيئاً من الماكول وقال الثوري لا يبيعه ولكن يجعله سقاً وشنأ في البيت - ريل اللوطار - ج ۵ ص ۱۳۸

حنفی فقہاء کی تصریحات اس بارہ میں یہ ہیں:-
ولما جاز الاكل متعادل على جوارئ الانتفاع بجلودها من غير جهة البيع ولذلك قال اصحابنا يجوز الانتفاع بجلد الاضحية و روى فوالك عن عمرو ابن عباس وعائشة وقال الشعبي كان مسروق يتخذ مسلماً اضحية مصلى و يصلي عليه -

(احکام القرآن، البکر جصاص ج ۳ ص ۲۹۳)

جب قربانی کا گوشت کھانا جائز ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی کھالوں سے آدمی نائدہ بھی اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ اس کو بیچ کر اس سے سرمایہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔ اسی وجہ سے ہمارے علماء کا مذہب یہ ہے کہ قربانی کی کھال سے نائدہ اٹھانا جائز ہے۔ یہی بات حضرت عمرؓ، ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی مروی ہے۔ شعبی کہتے ہیں کہ مسروق اپنی قربانی کی کھال کی جانماز بنا لیا کرتے اور اس پر نماز پڑھا کرتے۔

غور فرمائیے کہ زکوٰۃ و صدقات کی تمام معروف اقسام میں سے ہے کوئی قسم ایسی جس میں آدمی کے لیے یہ سارے تصرفات جائز ہوں کہ وہ اس سے خود بھی نائدہ اٹھا سکے اور بلا امتیاز امیر و غریب، سید و غیر سید، کسی دوسرے کو بھی دے سکے اور اس کو صدقہ بھی کر سکے؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو آخر یہ بات کس طرح صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ ساری شرطیں جو صدقات و واجبہ کے لیے مقرر ہیں وہ اس پر بھی لا کر چسپاں کر دی جائیں؟ ہم نے تھوڑی دیر کے لیے فرض کیا کہ تمہیکہ! دائیگی زکوٰۃ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے لیکن کیا قربانی کی

کھال زکوٰۃ اور صدقہ ہے کہ اس پر سارے احکام صدقہ اور زکوٰۃ کے عائد کیے جائیں؟
 میں نے تو مذکورہ بالا احادیث و اقوال کی روشنی میں جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ قربانی کے گوشت اور اسکی
 کھالوں کا معاملہ صدقات و زکوٰۃ کے سلسلہ سے تعلق رکھنے کے بجائے مکارم اخلاق، فیاضی، اور احسان و تبرع سے
 تعلق رکھتا ہے۔ آدمی ان کو کھائے کھلائے، خود بہتے اور دوسروں کو ہدیے، تحفے اور صدقہ کے طور پر دے۔ پس
 ان کو سنیت کر رکھنے یا بیچ کر سرمایہ بنانے کی فکر نہ کرے۔ غرباء اور محتاجوں کو اس میں سے پوری فیاضی کے
 ساتھ دے بلکہ فضیلت یہی ہے کہ اگر خود ضرورت محسوس نہیں کرتا تو سب کچھ صدقہ کر دے، جیسا کہ نبی
 صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے۔

عن علی بن ابی طالب قال امرنی رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم ان اقوم علی بدنہ وان
 اتصدق بجزء ما وجدھا واجلتھا
 رنیل الاوطار۔ ج ۵ ص ۱۳۷

حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
 مجھے حکم دیا کہ آپ کے قربانی کے اذنیوں کی قربانی کر اؤں اور
 ان کے گوشت، ان کی کھالیں یہاں تک کہ ان کے
 بھول سب صدقہ کر دوں۔

اس کی نوعیت عام صدقات و زکوٰۃ کی نہیں ہے کہ آدمی خود کسی نوعیت سے بھی ان سے خائف
 نہیں اٹھا سکتا یا ان کے اندر اس کا تعارف مخصوص قواعد و ضوابط کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ بلاشبہ اس
 بات کا حق رکھتا ہے کہ اگر کسی انجمن یا ادارہ کی خدمات کو غرباء کے لیے مفید پارہا ہے تو اس کو بے تکلف
 دے سکتا ہے۔ اس میں کسی تملیک کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

آخر میں یہ گزارش ہے کہ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اپنے علم کی حد تک میں نے صحیح دلائل سے صحیح
 نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ سب کچھ حرف ٹھیک ہی ہے
 اس وجہ سے میں یہ ذمہ داری کے خلاف سمجھتا ہوں کہ اس کو ایک حتمی اور قطعی رائے کی حیثیت سے پیش
 کر دوں۔ یا اپنے منصب کے متجاوز ہو کر اس کو فتوے کی حیثیت دوں۔ بالخصوص جبکہ اس کا تعلق ایک ایسے
 مسئلہ سے ہے جس میں بعض قابل اعتماد لوگوں نے اس سے مختلف رائے قائم کی ہے جو میں نے (باقی صفحہ پر)